باب ہشتم

آئی ایس آئی ..... پراسرار بندے

انٹر سروسز انٹیلی جنس (آئی ایس آئی) کو افغان جنگ کی نبرد آزمائی میں کئی سال ہو چکے تھے۔ بری فوج کے ایک ممتاز جنرل اپنے دوست اختر عبدالرحمٰن سے ملنے گئے۔ وہ ان سے باتیں کر رہے تھے۔ جب انہوں نے چوڑی چھاتی والے ایک تنومند پنجابی بریگیڈئر کو دیکھا۔ قدرے تعجب کے ساتھ انہوں نے سوال کیا کہ بری فوج کا یہ افسر یہاں کیا کر رہا ہے؟ رازداری میں اپنا ثانی نہ رکھنے والے آئی ایس آئی کے سربراہ نے ساتھی جنرل کے سوال کو بہت زیادہ اہمیت نہ دی اور سرسری انداز میں کہا، ''شاید وہ کسی کام سے آیا ہے۔''

بری فوج کے جرنیل کو معلوم نہ ہوسکا کہ مرعوب نہ ہونے یہ شجاع افسر ہی وہ شخص ہے، جو افغانستان میں جنگی کارروائیوں کی نگرانی کر رہا ہے۔ چیزوں کو خفیہ رکھنا ہی انٹیلی جنس ایجنسیوں کا کام ہے، لیکن جون 1979ء کے بعد سے جب اس ادارے کی تنظیم نو کا آغاز ہوا، آئی ایس آئی نے راز داری کے ایسے ایسے ریکارڈ قائم کیے کہ عسکری تاریخ جس کی چند ہی مثالیں پیش کر سکتی ہے۔ تا آنکہ مارچ 1988ء میں اوجڑی کیمپ کے سانحہ نے ایک بحث کا دروازہ کھولا، جس سے فائدہ اٹھا کر کے جی بی، را اور خاد نے کم نظر سیاسی عناصر اور بائیں بازو کے دانش وروں کی مدد سے پراپیگنڈہ کی مہم اٹھائی اور بعد ازاں امریکہ کی افغان پالیسی تبدیل ہونے کے بعد سی آئی اے کی مدد سے مغربی ذرائع ابلاغ اس میں شامل ہو گئے۔ پاک فضائیہ کے پائلٹوں کے بعد جنہوں نے 1965ء میں اپنی کارکردگی سے ایک عالم کو ششدر کر دیا تھا، آئی ایس آئی ہی وہ واحد ادارہ تھی، جہاں پاکستانیوں نے اپنے ہنر اور کارکردگی سے دنیا کو حیران کیے رکھا۔ آج یہی وہ ادارہ ہے، جو بیک وقت بھارت، امریکہ، روس اور ''اسلامی بم'' سے خوف زدہ اسرائیل کی آنکھوں میں کانٹا بن کر کھٹک رہا ہے اور جسے تباہ کرنے پر پاکستان کے سارے دشمن اکٹھے ہو گئے ہیں۔

ایک عام سے جاسوسی ادارے کی جگہ جسے 1971ء کے مشرقی پاکستان میں نو تخلیق ''را'' نے شکست فاش دی تھی، اور جسے وزیراعظم بھٹو کے ایک حکم کے تحت 1974ء سے سیاسی جماعتوں اور راہنماؤں کی نگرانی کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا تھا، یہ برتر ادارہ کیوں وجود میں آیا؟

جون 1978ء آئی ایس آئی کے درویش منش، عبادت گزار سربراہ جنرل ریاض اچانک دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ ریاض ایک بڑے منفرد آدمی تھے۔ وضو کے سلیپران کے کمرے میں رکھے رہتے، ان کے گھر کی خواتین بہت سختی سے پردے کا اہتمام کرتیں، اور انہوں نے کوئی جائیداد نہیں بنائی تھی۔ مشکلات میں گھرے صدر کو، جو آئی ایس آئی کو زیادہ کارگر ادارہ بنانے کے لیے متفکر تھے، جنرل ریاض کی موت سے صدمہ ہوا، لیکن جب ان کے جانشین کا سوال پیدا ہوا تو وہ زیادہ تامل کا شکار نہ ہوئے۔ نمایاں اور واضح ان کی نظروں کے بالکل سامنے ایک ایسا شخص موجود تھا، جس پر پوری طرح بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ جو جنگجو، محنتی، وفادار، تازہ خیالات کو قبول کرنے والا، چوکنا اور دور اندیش تھا۔ اس وقت سابق وزیراعظم کو پھانسی پر لٹکانے جانے کے بعد دنیا ان پر برہم تھی، دشمن پر نگاہ رکھنے والے ادارے اور خود ان کی ذات کو اسی شخص کی ضرورت تھی۔

پھانسی کے بعد بھٹو کے خاندان نے جواب تیزی سے بائیں بازو کے زیر اثر آ رہا تھا، بھارت، لیبیا، شام اور روس سے رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ لاہور ہائی کورٹ میں بھٹو کے بیان حلفی میں ترامیم اور اضافوں کے بعد ''اگر مجھے قتل کیا گیا'' کے نام سے جو کتاب مرتب کی گئی، وہ ان کے خاندان کی اجازت سے بھارت میں شائع کی گئی۔ ان کے بیٹے مرتضیٰ بھٹو کابل میں ''الذوالفقار'' کا مرکز قائم کر چکے تھے، جہاں ایک سال پہلے روس نواز کمیونسٹوں نے فوج کی مدد سے حکومت کا تختہ الٹ کر حکومت پر قبضہ کر لیا تھا۔ افغانستان میں ناراض پاکستانی نوجوانوں کو تخریب کاری کی تربیت دی جا رہی تھی۔ عرب ممالک جن سے بھٹو نے اپنے دور اقتدار میں قریبی مراسم قائم کر رکھے تھے، ضیاالحق سے ناخوش تھے، امریکہ اور مغربی یورپ کو اعتراض تھا کہ ایک سیاسی جماعت کی جگہ فوج اقتدار میں ہے۔ ملک کے اندر پاکستان قومی اتحاد کی سیاسی جماعتیں، جنہوں نے بھٹو کے ہاتھوں زخم کھائے تھے، اب اقتدار سے الگ ہو چکی تھیں، وہ مشکلات کا شکار آدمی کا ہاتھ بٹانے پر آمادہ نہ تھیں۔ سردار عبدالقیوم خان اور نواب زادہ نصر اللہ خان ایسے سیاست دان، جنہوں نے 1979ء میں بھٹو کی جاں بخشی کی اپیلیں کی تھیں، ضیاالحق سے بہت دور چلے گئے تھے۔ صدر اب تک اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ وہ ایسے آزادانہ انتخابات کے متحمل نہیں ہو سکتے، جس کے نتیجے میں بھارت، روس، لیبیا، شام، افغانستان سے در پردہ مراسم رکھنے والی پیپلز پارٹی ایک بار پھر اقتدار میں آ کر اپنے مخالفین کچل ڈالے۔ یہ صرف فلسفی اے کے بروہی نہ تھے، جنہوں نے انہیں یقین دلایا تھا کہ خدا نے انہیں ایک مقدس فریضہ سونپا ہے۔ بہت سے سیاست دان بھی راتوں کی تنہائی میں آ کر ان سے ملتے اور اصرار کرتے تھے کہ وہ اقتدار سے الگ نہ ہوں۔ ضیاالحق چاہتے بھی تو ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ شیر پر سوار تھے اور اسے نیچے نہیں اتر سکتے تھے۔ اگلے تین ماہ میں صدر پاکستان قومی اتحاد کی جماعتوں کو رجسٹریشن کے تحت پابندیاں قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے رہے اور ان کی یہ کوششیں ناکامی پر منتج ہوئیں۔ سیکرٹری جنرل پروفیسر غفور احمد اور صدر مولانا مفتی محمود کسی طرح اس پر رضامند نہ تھے۔ ادھر صدر کے ذہن میں شرکت اقتدار کا فلسفہ جنم لے چکا تھا۔ وہ بلدیاتی انتخابات کے ذریعے نئی قیادت ابھارنے کے آرزومند تھے اور سیاسی جماعتوں کو حدود و قیود میں رکھنا چاہتے تھے۔ حالات کے دباؤ کا شکار پاکستان قومی اتحاد اس راہ پر چلنے کیلئے تیار نہ تھا، جسے نورانی اور 1977ء میں شاہ ایران کے پاس حاضری دینے والے اصغر خان پہلے ہی خیر باد کہہ چکے تھے، بالآخر 16 اکتوبر 1979 کو صدر نے مکمل مارشل لا نافذ کرتے ہوئے سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد کر دی اور اخبارات پر سخت سنسر لگا دیا ریڈیو پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے اعلان کیا کہ ''اب مارشل لا کو مارشل لا کی طرح چلایا جائے گا۔'' اب ہر طرف لرزا دینے والا سناٹا تھا، خوف اور اندیشوں کی فصل اگ رہی تھی۔، دنیا بھر میں پاکستان کو گالی دی جا رہی تھی، جو ایک سرزمین بے آئین تھا، اور اس کا دفاع کرنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔

جون 1979ء میں میجر جنرل اختر عبدالرحمٰن، لیفٹیننٹ جنرل بنا دیے گئے، اور انہیں آئی ایس آئی کا سربراہ مقرر کر دیا گیا۔ صدر نے اس موقع پر ان سے طویل گفتگو نہیں کی اور صرف کہا کہ وہ جنرل ریاض مرحوم کے ہاتھوں اس ادارے کی تنظیم نو چاہتے تھے اور یہ کام اب انہیں کرنا ہوگا۔ جون کے ان گرم دنوں اور حبس زدہ شاموں میں جب بیدار مغز جرنیل نے ملک کی صورت حال پر سوچا ہوگا، تو ان کے دل و دماغ پر کیا گزری ہوگی۔ سندھ میں ''را'' پہلے سے زیادہ سرگرم تھی۔ افغانستان سے مہاجروں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور ملک کی شمالی سرحدوں پر امن کے آرزومند پاکستان پر افغان مجاہدین کی آمد کا الزام عائد کیا جا چکا تھا۔ ایران میں ایک عظیم الشان عوامی انقلاب نے ہر چیز کو درہم برہم کر ڈالا تھا۔ کیا جرنیل ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر نہیں رہ گیا ہوگا؟ کوئی نہیں جانتا کہ جنرل اختر اس وقت کیا سوچ رہے تھے۔ عمر بھر انہوں نے ایسے مناصب سے گریز کیا تھا، جن کا سیاست اور عوامی زندگی سے دور کا بھی واسطہ ہو، لیکن اب انہیں سرحدوں سے باہر ہی نہیں، اندر سے جنم لینے والے خطرات کا جائزہ لینا اور حکومت کو راستہ سجھانا تھا۔ یہ ان کی ذمے داری تھی اور وہ اپنی ذمے داریوں سے انحراف کرنے والے آدمی نہ تھے۔ طوفان کا شکار ہونے والے کسی بحری جہاز کے مسافر کی طرح، جو

ٹوٹے ہوئے جہاز کے کسی تختے کو پکڑ کر ساحل تک جا پہنچنے کا عزم کرے، ایک بے پناہ رجائیت کے ساتھ وہ ہمیشہ مصروف عمل رہنے اور ہدف پر نگاہ رکھنے والے شخص تھے۔ چنانچہ جون 1979ء میں جب وہ آئی ایس آئی کی بلند و بالا مرکزی عمارت میں داخل ہوئے تو ساری مشکلات کے باوجود وہ اپنے ہدف کے بارے میں پوری طرح واضح تھے۔ اپنی زیرکمان بیڑیوں، رجمنٹوں، بریگیڈوں اور ڈویژنوں کی طرح، جنہیں وہ 30 سال تک سنوارتے، بہتر بناتے اور مقابلے کا درس دیتے رہے تھے، انہیں ایک روایتی اور معمولی ادارے کو از سرنو تعمیر کر کے اپنے مقابل ادارے سے بہتر بنانا تھا۔ ''دوسروں سے برتر اور بہتر'' یہ اس آدمی کے طرز احساس کا سادہ سا اصول تھا، جس نے زندگی میں کبھی ہار نہیں مانی تھی، جس نے اپنی زندگی کی سیکڑوں اور ہزاروں شامیں پہاڑوں پر چڑھتے گزاری تھیں اور جسے اپنے آپ پر قابو تھا، جیسے ایک جہاندیدہ کاریگر کو مشین پر ہوتا ہے۔

جنرل اختر نے اپنی میز کے گرد افسروں کو جمع کر کے سوال کیا کہ اس تنظیم کو کیوں کر بہتر بنایا جا سکتا ہے، پھر انہوں نے ان سے الگ الگ بات شروع کر دی۔ ہر شخص کو اندازہ تھا کہ اس کا واسطہ کام کے معاملے میں ایک بڑے سخت آدمی سے ہے اور یہ صرف لائق اور اہل لوگ ہی اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکتے ہیں۔ جنرل کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ گیا اور ان کی باتیں سنتا رہا۔ جب تک کوئی شخص غیر متعلق بات نہ کرے، وہ گھنٹوں تحمل اور توجہ کے ساتھ اس کی بات سنتا اور گاہے گاہے کاغذ پر نوٹس لیتا۔ وہ سوال کرتا اور بات کرنے والے سے توقع رکھتا کہ وہ اس سوال کا صاف، دوٹوک اور براہ راست جواب دے۔ وہ کہانی سننے پر آمادہ نہ تھا اور تجاویز طلب کرتا تھا، جن پر عمل کیا جا سکے۔ وہ کئی ہفتے تندہی کے ساتھ اس کام میں جتا رہا، کس شعبے میں کتنے اور کس طرح کے عملے کی ضرورت ہے، کہاں سٹاف زیادہ ہے اور کہاں کم۔ ماضی میں کس نے اپنے فرائض مستعدی سے انجام دیے اور کس نے محض ماتحتوں کی کارکردگی پر انحصار کرنے کی کوشش کی۔ ادارے کو کہاں کہاں وسائل کی ضرورت ہے اور کس طرح کے نئے افسروں کی۔ جاسوسی کے مشکل کام کے لیے جو نئے حالات میں ایک چیلنج بن گیا تھا، کس طرح کے جدید آلات درکار ہیں۔ پھر اس نے اپنے افسروں سے کہا کہ وہ اسے دنیا میں جاسوسی کے بہترین اداروں کے بارے میں ایسی کتابوں کی فہرست بنا کر دیں، جن کے مطالعہ سے ان کے ڈھانچوں اور طریق کار کو سمجھا جا سکے۔ جنرل کو فائلوں سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ اگر اس کا مطالعہ ضروری ہوتا تو وہ اسے شام کیلئے اٹھا رکھتا۔ جب وہ سہ پہر کی ورزش اور سیر کے بعد گھر پر کام کیا کرتا تھا۔ وہ منصوبہ بندی اور حکمت عملی کا آدمی تھا اور اپنی توانائی غیر ضروری چیزوں پر صرف کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا۔ اس واضح ذہن کے ساتھ جو قدرت نے اسے بخشا تھا، اگلے دس بارہ ہفتوں میں اس نے ایک نقشہ مرتب کر لیا تھا۔ تنظیم میں تبدیلیوں، نئے افسروں، احتساب کے نظام، مزید وسائل اور نئے آلات کی ضرورت تھی۔ اس نے کاغذوں پر وزارت دفاع اور صدر کے لیے نوٹس بنائے اور ان سے رجوع کیا۔

آئی ایس آئی کے صدر دفتر میں، جہاں ایک سے ایک کائیاں اور چوکنا افسر موجود تھا، جلد ہی خوشگوار حیرت کے ساتھ محسوس کیا جانے لگا کہ جنرل جب کبھی وزارت دفاع یا صدر سے رجوع کرتا تو ہمیشہ اپنی بات منوا کر لوٹتا۔ اس کے پاس ہمیشہ ٹھوس دلائل ہوتے اور وہ کبھی ایسا مطالبہ کرنے سے گریز کرتا، جسے وہ جائز ثابت نہ کر سکے۔ ہفتوں سوچ بچار میں محو رہنے اور دوسروں کی باتیں سننے والا آدمی اب بدلا ہوا شخص تھا۔ تیزی اور اعتماد کے ساتھ ان نے احکامات صادر کیے۔ افسروں کے تبادلے کیے، بری فوج سے لائق اور محنتی آدمی ڈھونڈ ڈھونڈ کر انہیں ذمہ داریاں سونپیں، دفتر کے لیے سرعت کے ساتھ وہ چیزیں مہیا کی جانے لگیں، جن کی واقعی ضرورت تھی، یا جن کی مدد سے کام کو بہتر بنایا جا سکتا تھا۔ اپنے افسروں سے صاف صاف اس نے کہہ دیا کہ وہ آئی ایس آئی کو ایک جدید اور متحرک ادارہ بنانا چاہتا ہے اور یہ کہ اس میں کسی ایسے شخص کے لیے کوئی جگہ نہیں، جو کام سے شغف نہیں رکھتا۔ ایک سابق افسر نے کہا، ''جو کچھ کتابوں میں لکھا ہوا ملتا اور کہانیوں میں سنایا جاتا ہے، وہ ہم اپنے سامنے برپا ہوتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ ہم اس یقین کے ساتھ محنت کرتے تھے کہ ہماری تحسین کی جائے گی، اور کوتاہی کریں گے تو لازماً سزا ملے گی۔'' ایک اور اعلیٰ افسر نے جو کئی سال تک ادارے میں انتظامی زمے

داریاں انجام دیتا رہا، اور جسے کئی جنرلوں کے ساتھ کام کرنے کا تجربہ تھا، ایک واقعہ سناتے ہوئے کہا، ''صبح کے ایک اجلاس کے دوران انہوں نے ایک ریٹائرڈ جنرل سے جن کی خدمات معاہدے کے تحت حاصل کی گئی تھیں، ایک خاص موضوع پر پے در پے سوالات کیے، تو گھبرا کر اس نے کہا کہ وہ اس بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ ایک محتسب کی بے رحم آواز میں آئی ایس آئی کے سربراہ نے ریٹائرڈ جنرل سے کہا، ''تو آپ کہاں کیا کر رہے ہیں؟'' چنانچہ اسے آیندہ محتاط رہتے ہی بنی۔ ایک دوسرے افسر نے ایک خفیہ خط بھیجنے کے لیے اعلیٰ شخصیتوں کی فہرست مرتب کرتے ہوئے، ان میں ایک ایسے عہدیدار کا نام شامل کر دیا، جس کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ جنرل نے اسے دفتر طلب کیا اور جب وہ باہر نکلا تو ہمیشہ کے لیے یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ اس ادارے میں کام کرنے والا کوئی شخص غیر حاضر دماغی یا بے خبری کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

اس آدمی کی شخصیت کا ایک دوسرا رخ بھی تھا۔ کوئی افسر علیل ہو یا کسی کا بچہ بیمار ہو جائے، کوئی مصیبت میں جا پھنسے، یا ناگہانی صدمے سے دوچار ہو جائے، تو نہ صرف وہ اس کے لیے ہر ممکن رعایت کا اہتمام کرتا، بلکہ ذاتی دلچسپی لے کر اس کی مدد کرنے کی کوشش کرتا۔ نو سال کے عرصے میں اس نے دل کے امراض کا شکار ہونے والے ایک درجن سے زیادہ افسروں کو علاج کے لیے بیرون ملک بھیجا۔ مصیبت زدہ آدمی کی امداد ہی وہ واحد پہلو تھا، جہاں وہ ضابطوں سے انحراف پر آمادہ ہو جاتا، یا بعض اوقات صدر سے ذاتی مدد کی درخواست کرتا۔ ان کے معتمد نائب نے کہا، ''وہ سخت ڈسپلن میں کسا ہوا آدمی تھا اور دوسروں سے بھی نظم کی پابندی کا مطالبہ کرتا تھا۔ اس کے ہاں غلطی کی معافی تھی، مستی کی نہیں۔ اگر کوئی شخص پیشہ ورانہ طور پر نااہل اور اخلاقی طور پر گرا ہوا ہو، تو اسے سزا دینے کے لیے وہ آخری حد تک جا سکتا تھا۔ وہ بڑا سخت جان تھا، اس کے معیار پر پورا اترنا آسان نہ تھا۔

27 دسمبر 1979ء کو افغانستان میں روس کی فوجی مداخلت کے بعد سرخ خطرہ پاکستان کی سرحدوں تک پہنچا اور صدر نے مزاحمت کرنے کا فیصلہ کیا، تو چند مذہبی گروہوں اور جماعت اسلامی کے سوا، جو اگرچہ سیاسی عمل کی بحالی کا مطالبہ جاری رکھے ہوئے تھی، افغان حریت پسندوں کی مدد کے لیے کوئی بروئے کار نہ آیا۔ پی این اے اور پیپلز پارٹی پر مشتمل سیاسی جماعتوں نے ایم آر ڈی تشکیل دی اور انتخابات کا مطالبہ کیا۔ پی آئی اے کا جہاز اغوا کر کے کابل اور پھر دمشق لے جایا گیا۔ بے بسی اور لاچارگی کے عالم میں جب روس کی زیر اثر حکومتیں دہشت گردوں کی مدد کر رہی تھیں، ''الذوالفقار'' کی فراہم کردہ فہرست کے مطابق 54 قیدیوں کو رہا کر کے ملک سے باہر بھیج دیا گیا۔ ان میں سے زیادہ تر لندن میں جا ٹھیرے، جہاں برطانوی حکومت ان کی مالی مدد کرتی رہی، اور اگلے سالوں میں انہوں نے ''بنیاد پرستوں'' سے نفرت کرنے والے مغربی پریس اور پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے خلاف سرگرم یہودی لابی، امریکی اور مغربی سیاست دانوں کی مدد سے ضیاالحق کے خلاف طویل جنگ لڑی۔ ادھر سندھ میں ''را'' سرگرم عمل تھی۔ بھارت سے بڑے پیمانے پر لٹریچر چھپ کر آ رہا تھا اور جئے سندھ کے حامیوں میں بھارتی آزادانہ رقوم بانٹ رہے تھے۔

آئی ایس آئی کو نئی صورت حال میں زیادہ سرگرمی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینا تھے۔ جنرل پہلے سے زیادہ سخت گیر اور محتاط ہو گیا۔ افسروں کی تقرری کرتے ہوئے وہ سفارش مانتا اور نہ علاقے، ذات اور برادری کا حوالہ قبول کرتا۔ وہ ایک آدمی کو ذمے داری سونپتا اور پھر ہفتوں تک اس پر نگاہ رکھتا، پھر یا تو وہ بھاگ جاتا، یا معیار کے مطابق کام کرنے لگتا۔ سختی کے ساتھ بار بار اور مسلسل وہ اپنے ساتھیوں کو تلقین کرتا کہ وہ اپنی صحت کا خیال رکھیں۔ ایک افسر نے جب اس سے یہ کہا کہ اسے ورزش کرنے کا وقت نہیں ملتا تو اس نے جواب دیا، ورزش اور عبادت کو اس جواز پر ترک نہیں کیا جا سکتا، وقت پر نہیں کر سکتے تو بے وقت کرو۔''

زیادہ کام کرنے والوں کے لیے خصوصی مراعات کا اہتمام ہوتا۔ جوانوں، چپراسیوں اور کلرکوں کے کھانے کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا اور اگر اس میں کوتاہی یا بے احتیاطی ہوتی وہ سختی سے اس کا محاسبہ کرتا۔ بتدریج آئی ایس آئی محنتی اور پرعزم لوگوں کے لیے جنت اور کام چوروں کے لیے جہنم بنتی

گئی۔ یہ احساس عام ہونے لگا کہ اس ادارے سے وابستگی بڑی توقیر کی بات ہے۔ صدر بعض اوقات غیر متوقع طور پر انہیں طلب کر کے کوئی ذمے داری سونپتے۔ زکوہ آرڈیننس کے نفاذ کے خلاف شیعہ راہنماوں نے اسلام آباد میں ایک مظاہرہ کرتے ہوئے سیکرٹریٹ کا گھیراو کر لیا۔ وہ مذہبی قوانین کے نفاذ پر صدر ضیاالحق اور ان کی پرجوش حمایت کرنے والے سنی علما اور ان کی جماعتوں کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ وہ حکومت کو زکات دینے پر آمادہ نہ تھے اور ان کے کچھ دوسرے مطالبات بھی تھے۔ سیاسی اعتبار سے شیعہ علما کے پیروکار پھانسی پر چڑھ جانے والے ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی کے حامی تھے۔ سیکرٹریٹ کا رخ کرتے ہوئے ایک ممتاز اور اپنے فرقے میں محترم عالم دین نے بڑی جذباتی تقریر کی۔ انہوں نے کہا کہ وہ سیدنا امام حسین کی طرح کہتے ہیں کہ روشنیاں گل کر دی جائیں، اور جس کو جانا ہے وہ ابھی چلا جائے۔ جذبات اور ہیجان کا شکار مظاہرین مرنے مارنے پر تلے ہوئے تھے۔ اپنے مطالبات تسلیم کرائے بغیر ایک قدم پیچھے ہٹنے پر آمادہ نہ تھے۔ ان کے ساتھ مذاکرات کی ساری کوششیں ناکام رہیں، اور حکومت عملی طور پر یرغمال بنی بیٹھی تھی۔ تب صدر نے جنرل اختر عبدالرحمان سے کہا کہ وہ مذاکرات کریں۔ چند گھنٹوں کے اندر ایک معاہدہ طے پا گیا اور خون خرابے کا خطرہ ٹل گیا۔ جنرل اختر کے مزاج کی غیر معمولی لچک اور ہیجان میں اعتدال پر قائم رہتے ہوئے متوازن رویہ اختیار کرنے کی روش نے ہمیشہ ان کی مدد کی۔ وہ تعصب سے بالاتر ہو کر سوچ سکتے تھے اور لوگ ان پر اعتماد کرنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔

بعد ازاں ایران سے تعلقات بہتر بنانے میں انہوں نے بڑی مدد کی۔ ہر چند کہ ضیاالحق امام خمینی کا احترام کرتے تھے اور انہیں ایرانی انقلاب سے کوئی چڑ نہ تھی، لیکن افغانستان میں جاری جنگ نے انھیں امریکا کا قریبی حلیف بنا دیا تھا اور پاکستان امریکی امداد حاصل کرنے والے تین نمایاں ممالک کی فہرست میں شامل ہو چکا تھا۔ بہت سے ممتاز پاکستانی شیعہ، صدر کے مخالف تھے اور ایرانی حکومت کو ان کے خلاف اکساتے رہتے تھے۔ عراق کے ساتھ جنگ میں الجھا ہوا ایران پاکستان سے توقع رکھتا تھا کہ وہ اسی طرح اس کی مدد کرے، جس طرح 1965ء کی جنگ میں دیوقامت بھارت کی ناراضگی مول لے کر ایران پاکستان کی مدد کو آیا تھا۔ اس وقت جب جہاد افغانستان کے لیے سعودی عرب سب سے زیادہ مالی مدد فراہم کر رہا تھا، یہ کسی طرح ممکن نہ تھا۔ پاکستان میں بائیں بازو کے دانشور، پیپلز پارٹی کے حامی اور صدر سے ناراض سیاسی عناصر یہ تاثر دینے کے لیے سرگرم تھے کہ پاکستانی سرزمین کو ایران کے خلاف جاسوسی کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے اور یہ کہ بلوچستان میں خفیہ طور پر امریکی اڈے قائم ہیں۔ اس وقت جب افغانستان کی وجہ سے آئی ایس آئی اور سی آئی اے میں قریبی تعاون جاری تھا، ایرانی فطری طور پر اس پروپیگنڈے کا اثر قبول کر رہا تھا۔

صدر ضیاالحق، جنرل اختر سے اس بارے میں مشورہ کرتے رہے۔ وہ دونوں اس بات پر متفق تھے کہ ایران کو ناراض نہیں کیا جانا چاہیے۔ ہر چند کہ امریکی دباو بڑھتا جا رہا تھا، لیکن دونوں جرنیلوں کو یقین تھا کہ پاکستان کا دفاعی مستقبل ایران کے ساتھ قریبی تعلقات کا متقاضی ہے۔ ادھر ایرانی اخبارات ایسے کارٹون شائع کر رہے تھے، جن میں صدر ضیاالحق کو جی کارٹر کے بوٹ میں بیٹھے دکھایا گیا تھا، تو ایسے میں برف پگھلانے کے لیے کون سی راہ اختیار کی جائے، جبکہ ایرانیوں کے ساتھ اعلیٰ سطح کا رابطہ تقریباً ختم ہو چکا تھا۔

ایک رات دو بجے جنرل اختر نے اپنے ایک معتمد کو نیند سے بیدار کیا۔ انہوں نے بریگیڈئر کو پیار سے مخاطب کرتے ہوئے کہا، ''کیا تم ملک سے باہر جانا پسند کرو گے؟'' فوجی افسر ساری رات جاگتا رہا۔ وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے کس مشن پر کہاں بھیجا جا رہا ہے، لیکن وہ خوش دلی کے ساتھ حکم کی تعمیل کے لیے تیار تھا۔ اگلی صبح بتایا گیا کہ اسے ایران میں ملٹری سیکرٹری بنا کر بھیجا جا رہا ہے۔

نیا فوجی اتاشی شیعہ مکتب فکر سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ ایک کشادہ دل، قوت متخیلہ کا حامل اور ملک کا درد رکھنے والا آدمی تھا۔ اسے اپنا کام صفر سے شروع کرنا تھا۔ اس نے فارسی سیکھی اور ممتاز ایرانی شخصیتوں سے ذاتی مراسم قائم کیے۔ وہ جنرل اختر کے اس نظریے کا پرزور حامی تھا کہ پاکستان کو اپنے دفاع

کے لیے بھارت کو قابو میں رکھنے اور ترکی اور ایران کے ساتھ قریبی مراسم کی ضرورت ہے، اور یہ کہ صرف اسی صورت میں پاکستان اپنے نظریاتی اور جغرافیائی دفاع پر قادر ہوسکتا ہے۔ مستقل مزاجی کے ساتھ وہ اپنے کام میں لگا رہا، تا آنکہ ایک روز جنرل اختر کو ایران کو دورہ کرنے کا اشارہ موصول ہوا۔ یہ بڑی حیرت انگیز بات تھی کہ ایرانی پاکستان کی کسی سیاسی شخصیت یا وزارت خارجہ سے نہیں، انٹیلی جنس سروس کے سربراہ سے بات کرنا چاہتے تھے اور اس سے بھی زیادہ تعجب خیز بات یہ تھی کہ امام خمینی جو کسی سربراہ مملکت سے بھی بہت کم ملنے پر آمادہ ہوتے تھے، ان سے ملاقات کے لیے تیار تھے۔ تہران سے پاکستانی سفیر کو ساتھ لے کر جنرل اختر قم گئے، اور گلیوں سے ہوتے ہوئے اس مختصر سے مکان پر پہنچے، جہاں ہمیشہ اپنی ضد اور رائے پر قائم رہنے والا اونچے قد کا آدمی مقیم تھا۔ یہ جنرل اختر کی زندگی کے ان چند دنوں میں سے ایک تھا، جب انہوں نے اچکن اور جناح کیپ پہن رکھی تھی۔

معمولی سے اس مکان میں پاکستانی وفد کو ایک کمرے میں لے جایا گیا، جہاں امام خمینی ان کا خیر مقدم کے لیے اٹھے۔ وہ فرش پر بیٹھتے تھے اور لوگوں کے ساتھ ہاتھ ملانے سے گریز کرتے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں سال ہا سال تک ہر روز ہزاروں لوگوں سے ملنا پڑتا تھا اور اب وہ اس سے اکتا چکے تھے۔ ایرانیوں کو اس پر حیرت ہوئی کہ امام نے اپنا ہاتھ جنرل اختر کے لیے آگے بڑھایا اور پھر انہیں ساتھ لے کر فرش پر بیٹھ گئے۔ ہلکے نیلے رنگ والے کمرے میں، جس کے فرش پر بھی نیلے رنگ کا سستا ایرانی قالین بچھا تھا، وہ ایک دوسرے کے بالکل قریب ہو کر بیٹھ گئے۔ مختصر سادہ اور واضح الفاظ میں جنرل اختر نے روحانی پیشوا اور ایرانی انقلاب کے بانی کو بتایا کہ پاکستان، ایران سے بہتر تعلقات کا آرزومند ہے۔ خمینی خاموشی سے سنتے رہے اور جب جنرل اپنی بات ختم کر چکا تو انہوں نے اتنے ہی مختصر الفاظ اور بے ساختہ انداز میں کہا کہ وہ بھی دونوں ملکوں کے مراسم میں بہتری کے آرزومند ہیں۔ امام کی طرف سے انہیں سونے کی بنی تین آرائشی پلیٹوں کا تحفہ دیا گیا، جس پر قرآن مجید کی آیات لکھی تھیں اور وہ واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ خمینی اپنے مہمان کو الوداع کہنے کے لیے دروازے تک آئے۔ ایرانیوں کے لیے یہ بڑا تعجب خیز تھا۔ وہ تو کسی سربراہ مملکت سے بھی اتنی مروت نہیں برتتے تھے۔ انہوں نے سالوں، عشروں تک زمانے کی سختیاں سہی تھیں، اپنی جنگ تنہا لڑی تھی۔ اس علاقے میں انہوں نے امریکی استعمار اور شہنشاہیت کو اکھاڑ پھینکا تھا، وہ دنیا سے بے نیاز آدمی تھے اور کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ دونوں آدمی مصافحہ کر چکے تو پاکستانی سفیر نے بھی اپنا ہاتھ آگے بڑھایا، لیکن روحانی پیشوا نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ اسے شبہ تھا کہ یہ شیطان بزرگ امریکہ سے راہ و رسم رکھتا ہے۔ بعد میں اس سفیر کو جلد ہی واپس بلا لیا گیا۔

پاکستان کے دفتر خارجہ کو، جہاں قدم قدم پر امریکہ کے پرجوش حامی موجود تھے۔ اس ملاقات کی خبر ملی تو اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا، لیکن صدر نے جو ہمیشہ سب کی بات سننے کے لیے تیار رہتے تھے، اس کی کوئی پرواہ نہ کی۔ برف پگھل چکی تھی، جیسا کہ ایک ممتاز شخصیت کا کہنا ہے کہ جنرل اختر نے ایرانیوں کے لیے جو کچھ کیا، وہ اسے کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔ (ہر چند کہ اس کی تفصیلات موجود ہیں، تاہم ہر ملک کی اپنی محفوظ معلومات ہوتی ہیں، جن کا تحفظ ناگزیر ہے۔) علی اکبر ولایتی نے اگلے دنوں میں پاکستان کے کئی خفیہ دورے کیے اور جنرل اختر سے ملتے رہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ امریکیوں کو ان تعلقات کی سن گن مل گئی ہو، اور کیا بعید ہے کہ یہیں سے جنرل اختر اور ان کے لیڈر صدر ضیاالحق سے ان کی ناراضگی کا آغاز ہوا ہو۔

یہ صرف ایران ہی نہیں، جس کا جنرل اختر نے خفیہ دورہ کیا، وہ سری لنکا بھی جاتے رہے۔ اور ایک بار تو صدر ضیاالحق کو ساتھ لے کر افغانستان کے ایک جنگی محاذ پر بھی گئے۔ سری لنکا، پاکستان کے لیے اہم تھا، جس سے بہت سے میدانوں میں تعاون جاری تھا۔ بعد میں دوسروں کے علاوہ عسا کر پاکستان کی ایک اساطیری شخصیت بریگیڈیئر ٹی ایم کو بھی سری لنکا بھیجا گیا۔ سری لنکا، بھارت کے غلبے سے بچنے کے لیے ہاتھ پاوں مار رہا تھا۔ گرانڈیل بھارت کی سازشوں سے خوف زدہ یہ ننھا سا ملک آئی ایس آئی کے لیے بھارتی سرگرمیوں کے بارے میں جاننے کا ایک بڑا ذریعہ تھا۔

بظاہر افغانستان ہی سب سے بڑا مسئلہ دکھائی دیتا تھا، لیکن یہاں آئی ایس آئی کو سی آئی اے کا تعاون حاصل تھا، جو سٹیلا ئٹ سے حاصل کی جانے والی تصاویر اور دوسرے جاسوسی ذرائع کی مدد سے روسیوں کی سرگرمیوں کے بارے میں بہت قیمتی اور فراواں معلومات مہیا کرتی تھی۔ دردسر تو بھارت تھا، جس کے ایجنٹ پورے ملک بالخصوص سندھ میں سرگرم تھے، جو ''الذوالفقار'' کی سرپرستی کر رہا تھا اور پاکستان کی بعض نمایاں شخصیتوں سے اس کے مراسم تھے۔ سوویت یونین کی خفیہ ایجنسی ''کے جی بی'' اور افغانستان کی ''خاد''، پاکستان میں گڑبڑ پھیلانے کے لیے ''را'' سے تعاون کر رہی تھی۔

متفکر ضیاالحق نے جنرل اختر سے سوال کیا کہ بھارتی دباو کا حل کیا ہے؟ جنرل اختر کو یقین تھا کہ بھارتی کبھی شرافت کی زبان نہیں سمجھیں گے۔ وہ پاکستان کے وجود کو دل سے تسلیم نہیں کرتے اور اکھنڈ بھارت اب بھی ان کی منزل ہے۔ انہوں نے صدر کے سامنے ایک منصوبہ پیش کیا۔ یہ حیران کن اور متذبذب کر دینے والا تھا۔ صدر خاموش رہے اور انہوں نے کہا، اس پر بہت احتیاط کے ساتھ غور وفکر کی ضرورت ہے، لیکن جنرل اختر پہلے ہی کافی سوچ بچار کر چکے تھے۔ مکمل مفاہمت سے پیدا ہونے والے اس یقین کے ساتھ جواب ان دونوں میں کارفرما تھی۔ انہوں نے اس منصوبے پر عمل درآمد کا آغاز کر دیا۔ آئی ایس آئی نے بھارت میں اپنی جڑیں پھیلا دیں۔ اندرا گاندھی کے دفتر سے ایک سے زیادہ فائلیں پاکستان پہنچا دی گئیں۔ بھارتی فوج کی نقل وحرکت پر نگاہ رکھی جانے لگی۔ کشمیر کے حالات کا مطالعہ کیا گیا اور ان لوگوں کی تلاش شروع کر دی گئی، جو تحریک آزادی کی قیادت کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی صدر نے امن کے حملے Peace Offensive کا آغاز کر دیا۔

انہوں نے بھارتی ادیبوں، اخبار نویسوں اور اداکاروں سے ذاتی مراسم قائم کیے اور اس میدان میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بھارتی سرزمین پر آئی ایس آئی کا جال اتنا وسیع اور اس قدر گہرا ہو گیا کہ دسمبر 1986ء میں جب بھارت نے براس ٹیک مشقوں کے نام پر پاکستان پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا تو پاکستانی ایجنٹ اس کی ساری تفصیلات لے اڑے۔ جہاں کہیں بھارتی افواج نے پاکستانی سرحدوں کی طرف حرکت کی، انہوں نے پاکستانی دستوں کو اپنے سامنے پایا۔ سخت کشیدہ ماحول میں صدر نے ملک کو جنگ سے بچانے کی کوششیں جاری رکھیں اور وہ کرکٹ کا میچ دیکھنے بھارت کی سرزمین جے پور شہر جا پہنچے۔ اس پر ایک ممتاز بھارتی اخبار نے لکھا ''جس طرح پاکستان کی کرکٹ ٹیم ہمیشہ بھارتیوں کو ہرا دیتی ہے، صدر ضیاالحق ہمیشہ ہمارے حکمرانوں کو زچ کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔'' پاکستان واپس پہنچ کر صدر ضیاالحق نے فوجی افسروں کے ایک اجلاس کی صدارت کی، جس میں جنرل اختر عبدالرحمٰن کو خراج تحسین پیش کیا گیا کہ ان کی آئی ایس آئی نے ملک کو جنگ اور تباہی سے بچا لیا۔ نہ صرف صدر بلکہ کئی دوسرے جرنیلوں نے کہا، اس کا سہرا اس آدمی کے سر ہے، جس نے کبھی خود آگے بڑھ کر کریڈٹ لینے کی کوشش نہیں کی۔

جنرل اختر کو بھارتیوں سے اور بھارتیوں کو جنرل اختر سے چڑ تھی۔ ایک صبح بھارت سے ایک ٹیلکس موصول ہوا، جس میں بتایا گیا کہ بھارتیوں نے نئی دہلی میں پاکستانی سفارت خانے کے ایک اہلکار کو مار پیٹا۔ جنرل اختر نے اپنے ایک ماتحت کو طلب کیا اور یہ ٹیلکس اس کے حوالے کی۔ انہوں نے کوئی تفصیل نہیں بتائی اور اشارے سے کہا کہ بھارتیوں کا قرض چکا دیا جائے۔ یہ افسر اس وقت کمرے سے باہر نکل رہا تھا، جب انہوں نے قدرے بلند آواز میں کہا، dont kill him ، اسے جان سے نہ مار ڈالنا۔ اسی شام آئی ایس آئی کے تربیت یافتہ کارکنوں نے بھارتی سفارت خانے کے ایک اہلکار کو جا لیا۔ جس افسر کو یہ ذمے داری سونپی گئی تھی، وہ کچھ زیادہ ہی پرجوش نکلا۔ اس نے بھارتی افسر کو دو چار تھپڑ رسید کرنے کے بجائے جی بھر کر اس کی پٹائی کی، اس کا لباس اتروایا، اور رات کی تاریکی میں اسے اسلام آباد کی ایک سڑک پر چھوڑ دیا۔ لیکن جب یہ اطلاع ایوان صدر پہنچی تو ایک دوسرا گروپ بھیجا گیا۔ انہوں نے اسے پہننے کے لیے نئے کپڑے دیے، نئی جرابیں، بوٹ اور گھڑی۔ نہا دھو کر، کپڑے بدل کر، جب وہ سفارت خانے پہنچا تو اسے اپنے ساتھیوں کو یقین دلانے کے لیے بڑی محنت کرنی پڑی کہ اس کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے۔ اگلی صبح بھارتی سفیر صدر پاکستان اور اس کا فوجی

اتاشی، جنرل اختر سے ملاقات کے لیے فون کرتے رہے۔

آئی ایس آئی کے ایک سابق افسر نے اس واقعہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بے نظیر کے دور حکومت میں نئی دہلی میں ایک سینئر پاکستانی افسر کے ساتھ توہین آمیز سلوک کا حوالہ دیا اور کہا، اب حالات کس قدر بدل گئے ہیں۔ ہمارے ایک اعلیٰ افسر کی بے عزتی کی جاتی ہے اور ہم خاموش ہو رہتے ہیں۔ دکھ اور رنجیدگی کے ساتھ اس نے کہا، ''ہم اتنے بے شرم ہو گئے، اتنے گر گئے۔''

ایک سے زیادہ بار ایسے بھارتی ایجنٹ پکڑے گئے، جنہیں جنرل اختر کو قتل کرنے کا ہدف دیا گیا تھا۔ آئے روز ایسے بے نام خطوط موصول ہوئے، جن میں جنرل اختر اور ان کے اہل خاندان کو ہلاک کرنے کی دھمکیاں ہوتیں۔ یہ بھی ایک وجہ تھی کہ جنرل کی زندگی میں ان کے چاروں بیٹے ملک سے باہر تھے اور خاندان کی حفاظت کے لیے سخت انتظامات کیے جاتے تھے۔ ان کے بیٹوں میں سے کوئی وطن واپس آنا چاہتا، تو اسے پہلے اپنے والد سے اجازت لینا پڑتی اور یہ اجازت ہر بار نہیں ملتی تھی۔ سہ پہر کی جوگنگ کے لیے وہ آرمی ہاؤس کے عقیب میں اپنے گھر سے کار میں سوار ہو کر آرمی ہاؤس کے سامنے والے دروازے سے گالف کورس میں داخل ہوتے تو جھاڑیوں میں بیٹھے کمانڈوز ان کی حفاظت کر رہے ہوتے۔

جنرل اختر عبدالرحمٰن نے کشمیر کی آزادی کے لیے جو منصوبہ بنایا گیا، اسے 1991ء میں بروئے کار آنا تھا۔ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ افغانستان کی آزادی کے ہدف کو ذہن میں رکھ کر بنایا گیا تھا۔ جو ان کی رائے میں 1989ء کے موسم بہار میں حاصل کی جا سکتی تھی۔ تاہم اس کے لیے کام کا آغاز 1984ء میں کر دیا گیا۔ افغان حریت پسندوں کے برعکس جن کی تعداد کو آئی ایس آئی کے افسروں نے تربیت دی، کشمیر کے لیے بالکل دوسری حکمت عملی اختیار کی گئی، چونکہ بھارت کے مقبوضہ علاقے سے بڑی تعداد میں لوگ آسانی سے پاکستان نہیں آ سکتے تھے، اور ایسا کرنے کی صورت میں دوسری مشکلات کے علاوہ رازداری ختم ہونے کا بھی احتمال تھا، لہذا صرف ایسے لوگوں کو تربیت دی گئی، جو بعد میں دوسروں کو سکھا سکیں۔ جیسا کہ بعد ازاں کشمیری چھاپہ مار راہنما شبیر شاہ نے بھارتی جریدے ''انڈیا ٹوڈے'' کو ایک انٹرویو میں بتایا کہ جنرل اختر کو اس عمل سے اتنی دلچسپی تھی کہ وہ ذاتی طور پر ان کشمیریوں سے ملے، جو اپنے وطن کی آزادی اور پاکستان سے اس کے الحاق کے لئے جانیں ہتھیلیوں پر لے کر نکلے تھے۔ کشمیریوں کے کئی گروپوں کو مجاہدین کے ساتھ افغانستان بھجوایا گیا، اور رازداری کا ایسا اہتمام کیا گیا کہ خود مجاہدین کو ان لوگوں کے بارے میں کوئی معلومات نہ تھیں۔ وہ انہیں عام پاکستانی سمجھتے تھے، اور جو اردو بولتے اور جہاد کے جذبے سے ان کے ساتھ جا رہے تھے۔ کشمیریوں کو کچھ اسلحہ بھی دیا گیا، جو افغان حریت پسندوں کے استعمال کے لیے موزوں نہ تھا۔ 17 اگست 1988ء کو صدر ضیاالحق اور ان کے ممکنہ جانشین کی ناگہانی موت نے کشمیریوں کو اپنا منصوبہ وقت سے پہلے اور اپنے طور پر بروئے کار لانے پر مجبور کر دیا، اور اب وہ اپنی جنگ پاکستان کی مدد کے بغیر لڑ رہے ہیں۔

مشرقی پنجاب کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے جہاں سکھ آزادی کے لیے بھارتی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے، ایک بریگیڈئر کی قیادت میں خصوصی ڈیسک بنایا گیا۔ اگرچہ اس علاقے میں ''را'' کے ایجنٹوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، لیکن سکھوں نے پورے صوبے میں آگ لگا دی۔ وہ جانتے تھے کہ انہیں کس شخص کو قتل کرنا، کہاں بم رکھنا اور کس دفتر کو ہدف بنانا ہے۔ جلد ہی بھارت کی مرکزی حکومت چیخ اٹھی کہ پاکستان سکھوں کی مدد کر رہا ہے، حتیٰ کہ یہاں پاکستان پیپلز پارٹی کی سربراہ محترمہ بے نظیر بھٹو نے کہا کہ پاکستان سکھ کارڈ استعمال نہ کرے، ورنہ بھارت سندھ کارڈ استعمال کرے گا۔ نیپال کی سارک سربراہ کانفرنس میں جب وزیراعظم جونیجو سے ملاقات میں راجیو گاندھی نے یہ سوال اٹھایا تو انہوں نے جواب دیا کہ پاکستان سندھ میں بھارتی سرگرمیوں اور سرحد پار تخریب کاروں کی تربیت کے بارے میں دستاویزی ثبوت مہیا کر سکتا ہے، کیا بھارت مشرقی پنجاب میں پاکستان کے ملوث ہونے کی کوئی شہادت پیش کر سکتا ہے۔ مارچ 1987ء میں جب جنرل اختر عبدالرحمٰن آئی ایس آئی سے الگ ہو کر جوائنٹ چیفس

آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین بنائے گئے تو آئی ایس آئی نے بھارتی سفارت خانے سے نئی دہلی کے ساتھ کی جانے والی ایک گفتگو ریکارڈ کی، جس میں اس واقعہ پر مسرت کا اظہار کیا گیا تھا، ''بھگوان کی کرپا ہے کہ اس جرنیل سے ہماری جان چھوٹی۔''

بھارت میں پاکستان کی جاسوسی سرگرمیوں نے بھارتیوں کیلئے آگے بڑھ کر وار کرنا مشکل بنا دیا، چنانچہ صدر ضیاالحق کے دور اقتدار میں جب افغانستان ایک تباہی سے دوچار تھا، سری لنکا میں خانہ جنگی ہو رہی تھی، ایران عراق کے ساتھ جنگ میں الجھا ہوا تھا، پاکستان اس خطے میں استحکام کا واحد جزیرہ تھا۔ افغان جنگ کی وجہ سے امریکہ سے حاصل ہونے والی عسکری امداد کے بل پر پاکستانی فوج کی تعمیر نو کی گئی، اور اسے ایف 16 طیاروں سمیت بہترین اسلحہ سے لیس کر دیا گیا۔ جنرل ضیاالحق نے اپنے دورہ امریکہ میں ایک ٹیلی وژن انٹرویو میں اپنی حکومت کے کارناموں کا تذکرہ کرتے ہوئے انٹیلی جنس کے شعبے کی کامیابیوں کا خاص طور پر حوالہ دیا۔ سانحہ سترہ اگست کے چھ ماہ بعد بے نظیر بھٹو کے وزیراعظم بننے پر بھارتی وزیراعظم راجیو گاندھی پاکستان کے دورے پر آنے سے ہچکچا رہے تھے۔ حکومت پاکستان کے نام ایک پیغام میں انہوں نے اس اندیشے کا اظہار کیا کہ اسلام آباد میں بھارت سے نفرت کرنے والے آئی ایس آئی کے ایجنٹ انہیں ہلاک کر سکتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھ ''را'' کے ایجنٹوں اور محافظوں کی ایک بڑی تعداد لے کر آئے، جو ان کے راستوں کی نگرانی کرتے رہے۔ وزیراعظم بے نظیر بھٹو سے علیحدگی کی ملاقات میں انہوں نے جس نکتے پر سب سے زیادہ زور دیا، وہ یہ تھا کہ آئی ایس آئی کو ختم کر دیا جائے۔ انہوں نے وزیراعظم سے کہا، یہ ادارہ ان کے اقتدار کو خطرے میں ڈال سکتا ہے۔

آٹھویں عشرے کے وسط میں خود امریکیوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ آئی ایس آئی تیسری دنیا کی سب سے طاقتور جاسوسی تنظیم بن چکی ہے۔ پاکستانی افسروں سے ملاقاتوں میں سی آئی اے کے افسر برملا کہتے تھے کہ اس ادارے نے شہرہ آفاق اسرائیلی تنظیم موساد کو پیچھے چھوڑ دیا ہے، جو عربوں کی عسکری شکست میں مرکزی کردار ادا کرتی رہی ہے۔ وہ اعتراف کرتے تھے کہ بعض اعتبار سے یہ ادارہ سی آئی اے سے بھی بہتر ہے۔ مثلاً وہ نکاراگوا اور کیوبا میں امریکی خفیہ ادارے کی جنگی کاروائیوں کا موازنہ افغانستان میں آئی ایس آئی کی کوششوں سے کرتے اور پاکستانی اداروں کو خراج تحسین پیش کرتے۔ ایک بار جب جنرل اختر سے اس موضوع پر تبصرہ کرنے کو کہا گیا، تو انہوں نے کہا کہ امریکی اس میدان میں ہمارے ہم پلہ کیسے ہو سکتے ہیں؟ ہمارے لوگ شہادت کو ایک اعزاز سمجھتے ہیں، ان کا ایک نظریہ اور عقیدہ ہے اور وہ موت سے خوف زدہ نہیں ہوتے۔

آئی ایس آئی کے ملازمین کی تعداد بتدریج لاکھوں تک جا پہنچی۔ ماضی کی اس ایجنسی کے مقابلے میں جس کے اہل کار بعض اوقات سائیکلوں پر سفر کرتے تھے، اس کے ملازمین کے پاس موٹر سائیکلیں، کاریں اور دوسری گاڑیاں تھیں۔ ہر شہر میں اس کے دفاتر قائم تھے۔ ڈاک کی بجائے اب اس کے پیغامات ٹیلی فون کے ذریعے ایک سے دوسرے شہروں پہنچائے جاتے اور معلومات تیزی سے صدر دفتر پہنچائی جاتیں۔ ایسے پرانے افسروں کو بیک بینی دوگوش نکال دیا گیا، جو اخلاقی کمزوریوں کا شکار تھے۔ ''میں انہیں گردن سے پکڑ کر صدر کے حوالے کر دیتا ہوں۔'' ایک بار جنرل نے کہا، ''وہ ان میں سے بعض کو سزا دیتے ہیں، اور بعض کو معاف کر دیتے ہیں۔''

یہ سب کچھ خاموشی کے ساتھ انجام پا رہا تھا۔ بعض اوقات جنرل کے ماتحت ان سے درخواست کرتے کہ وہ اپنے کارناموں کا کریڈٹ لینے سے اس قدر نہ ہچکچائیں نہیں۔ وہ ریڈیو، ٹی وی، اخبارات اور عالمی پریس سے اس قدر گریز کا راستہ اختیار نہ کریں، لیکن وہ اس معاملے میں بے حد واضح تھے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ خفیہ اداروں اور ان سے متعلق افراد کو ہر حال میں نظروں سے اوجھل رہنا چاہیے۔ وہ تقریبات میں جانے سے گریز کرتے اور جب صدر مملکت کی وجہ سے ایسا کرنا ضروری ہو جاتا تو افواج کے شعبہ تعلقات عامہ ٹیلی وژن کو ہدایت بھجوائی جاتی کہ جنرل اختر تصویر میں دکھائی نہیں دینے چاہییں۔ ٹی وی کیمرہ حرکت ہوا آتا اور جرنیل کے قریب آ کر رک جاتا۔ یہی نہیں وہ غیر ممالک کے دوروں سے بھی گریز کرتے۔ سی آئی

اے کے سربراہ ولیم کیسی نے بارہا انہیں امریکہ کے دورے کی دعوت دی، لیکن کام میں مگن رہنے والا آدمی انہیں ٹالتا رہا، حتیٰ کہ ایک بار اس نے صدر کی موجودگی میں اس پر آمادہ کرنا چاہا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اس نادر آدمی کو امریکی صدر سے ملوائیں، اور غالباً مسٹر ریگن سے اس کا وعدہ بھی کر چکے تھے، لیکن جنرل انہیں ٹالتا رہا، حتیٰ کہ مسٹر کیسی نے اس پر واضح ناراضگی کا اظہار کیا۔ جنرل کی شہادت کے بعد اس کے جانشین ولیم ویسٹمر تعزیت کے لیے آئے تو انہوں نے چاروں بیٹوں کو خوبصورت فریموں مین ورڈز ورتھ کی مشہور نظم The Happy Warrior (خوش دل جنگجو) کا تحفہ پیش کیا ۔ یہ نظم ایک ایسے جانباز کی تصویر پیش کرتی ہے، جو اپنے وطن اور قوم کے لیے رزم آرائی میں مگن رہتا ہے اور جس کے لیے زندگی سادگی، توقیر اور بے نیازی کا نام ہے۔

آئی ایس آئی نے حکومت کے خلاف ایک سے زیادہ سازشوں کا سراغ لگا کر انہیں ناکام بنایا۔ ان میں سے ایک وہ تھی، جو لندن میں مقیم غلام مصطفےٰ کھر نے بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' کی مدد سے تیار کی تھی، اور جس کے لیے اسلحہ لاہور پہنچا دیا گیا تھا۔ اس سازش کی پس پردہ کہانی بائیں بازو کے وکیل رضا کاظم نے ایک کتاب میں تفصیل سے بیان کی ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ خطرناک سازش وہ تھی، جو بری فوج کے ایک میجر جنرل تجمل حسین نے جنرل چشتی کے ناکام منصوبے کے کچھ عرصہ بعد مرتب کی۔ وہ 23 مارچ 1980ء کی تقریب میں صدر کو ہلاک کرنا چاہتے تھے۔ وہ مذہبی انتہا پسند تھے اور ان کے خیال میں صدر نے تیزی سے اسلامی قوانین نافذ کرنے کی ذمے داری پوری نہ کی تھی اور یہ کہ وہ اقتدار پر فائز رہنے کے حقدار نہ تھے۔ یہ پرواہ کیے بغیر کہ اس کے نتیجے میں کیسا بحران پیدا ہو سکتا ہے، وہ اپنے منصوبے پر عمل درآمد کا تہیہ کیے ہوئے تھے۔ آئی ایس آئی نے وقت سے پہلے ہی انہیں جا لیا۔ جب وہ بعض فوجی افسروں سے رابطہ کر کے انہیں اپنے منصوبے میں شرکت پر آمادہ کر رہے تھے۔ کسی شور شرابے اور ہنگامے کے بغیر ان پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور انہیں سزا سنا دی گئی۔ سانحہ سترہ اگست کے بعد ان دونوں مصطفےٰ کھر اور میجر جنرل تجمل حسین کو رہا کر دیا گیا۔

ملک کی اندرونی صورتحال کے حوالے سے شخصیتوں، جماعتوں، اداروں اور علاقوں کے بارے میں جنرل اختر کے پاس تازہ ترین معلومات کا ایک انبار پہنچتا رہتا تھا۔ وہ ہر نئی پیش رفت سے آگاہ رہتے اور حالات کے بہترین تجزیے پر قادر ہو گئے تھے۔ صوبوں کے وزرائے اعلیٰ اور گورنران سے مشورہ حاصل کرنے کے لیے فون پر رابطہ کرتے، بعض اوقات یہ گفتگوئیں بڑی طویل ہوتیں۔ انہیں امن وامان سے لے کر خارجہ پالیسی تک سے متعلق اجلاسوں میں مدعو کیا جاتا۔ ایک سابق افسر کے بقول، ''جب جنرل اختر بولتے تو ہر شخص خاموش ہو جاتا۔''

صدر ضیاالحق اپنے معتمد اور باخبر ساتھی کے ہر مشورے پر عمل نہیں کرتے تھے۔ ان کے جو مشورے مسترد کر دیے گئے، ان میں سے ایک 1985ء کے انتخاب میں وزیراعظم کی نامزدگی سے متعلق تھا۔ جنرل اختر جو ایک عرصے سے مصطفےٰ جتوئی کو وزیراعظم بنانے کی حمایت کر رہے تھے، ان کے کھیل میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے اب سندھ کے الٰہی بخش سومرو کا نام تجویز کر رہے تھے، لیکن صدر نے ان پر محمد خان جونیجو کو ترجیح دی، جو 1978ء میں جب پاکستان قومی اتحاد کی جماعتیں اقتدار میں شامل ہوئیں، صدر کی کابینہ میں رہ چکے تھے۔ وہ بظاہر ایک مودب اور تعاون کرنے والے آدمی نظر آتے تھے۔ کم گو اور غیر ذہین دکھائی دینے والے جونیجو کو شریف آدمی سمجھا جاتا تھا، لیکن ان کا سب سے بڑا اعزاز شاید یہ تھا کہ وہ مسلم لیگ سے تعلق رکھتے تھے اور شاہ مردان پیر پگاڑا کے قریبی ساتھی۔

اس بات کی کبھی قابل فہم وضاحت نہیں کی گئی کہ جونیجو، خود اقتدار سونپنے والے آدمی کے خلاف کیوں ہو گئے، جس نے بہت سے اختیارات ان کے سپرد کر دیے تھے، جو مداخلت سے گریز کرتا تھا اور جو دوسروں کی توہین کرنے والا نہ تھا۔ بعض لوگوں کے خیال میں ان کے گرد و پیش کے بعض لوگوں نے انہیں گمراہ کیا۔ جب محمد خان جونیجو کو باور کرا دیا گیا کہ حالات ان کے لیے سازگار ہیں، تو انہوں نے آگے بڑھ کر زیادہ سے زیادہ قوت حاصل کرنے کی

کوشش کی۔ کیا اس عمل میں انہیں امریکیوں کی تائید حاصل تھی، یا پارلیمنٹ اور کابینہ کے بعض ارکان انہیں شہ دے رہے تھے۔ان رازوں سے خود محمد خان جونیجو ہی پردہ اٹھا سکتے ہیں، اور غالباً وہ کبھی ایسا نہیں کریں گے۔

کچھ بھی ہو، جنرل اختر نے کم از کم ایک موقع پر وزیراعظم کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ غلط راہ پر چل نکلے ہیں۔ وہ اس وقت ایک عرب ملک کے دورے پر تھے، اور جونیجو جو اعلیٰ سرکاری شخصیتوں کو صدر سے برگشتہ کر کے اپنے قریب لانے کی کوششوں میں لگے رہتے تھے، جنرل اختر کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔عرب سربراہ کے ساتھ جونیجو کی گفتگو جنرل اختر کو پسند نہیں آئی اور انہوں نے ان سے ہمیشہ کی طرح سادہ اور دوٹوک انداز میں کہہ دیا کہ وہ وزیراعظم کے مرتبے کے فروتر انداز اختیار کیے ہوئے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد جونیجو ان سے مایوس ہو گئے اور غالباً ناراض بھی کہ انہوں نے اوجڑی کیمپ کے سانحہ کے بعد انہیں الگ کرنے کا منصوبہ بنایا۔

صدر نے محمد خان جونیجو کو غیر جماعتی انتخابات کے بعد پارٹی بنانے کی اجازت کیوں دی، اس سوال کا کبھی تسلی بخش جواب نہیں دیا گیا۔ یہ صدر کے اصل منصوبے کے برعکس تھا۔ پیپلز پارٹی سے الگ ہو کر 1985ء کے انتخابات میں حصہ لینے والے نسیم آہیر کے خیال میں یہ صدر کی مفاہمت پسندی اور حد سے زیادہ نرم مزاجی کی وجہ سے ہوا۔اب جبکہ وہ انتخابات کرا چکے تھے، وہ اس نظام کو کامیاب ہوتا دیکھنا چاہتے تھے۔لیکن یہ سوال پھر بھی اپنی جگہ باقی رہتا ہے کہ جونیجو جن کی اپنی کوئی طاقت نہ تھی، یکا یک اتنے طباع اور دلیر کیسے ہو گئے تھے اور اپنی رائے پر اس قدر اصرار کیوں کرنے لگے تھے۔

صدر کا اصل منصوبہ کیا تھا؟ نسیم آہیر کی داستان سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ یہ داستان اس سوال جواب بھی فراہم کرتی ہے کہ جنرل اختر سیاسی طور پر کس طرح جنرل ضیاالحق کی مدد کر رہے تھے۔نسیم آہیر ''الذوالفقار'' کی طرف سے 1981ء میں پی آئی اے کا طیارہ اغوا کرنے کے بعد سے، پیپلز پارٹی کی قیادت کے بارے میں مایوسی کا شکار تھے اور اس کے طرز عمل کو حب الوطنی کے تقاضوں کے منافی سمجھنے لگے تھے۔ یہ بات خفیہ ایجنسی کے علم میں بھی تھی۔ایم آر ڈی نے 14 اگست 1983ء سے صدر کے خلاف تحریک چلانے کا فیصلہ کیا تو آہیر اس کے حق میں نہ تھے۔ پارٹی کے ایک اجلاس میں انہوں نے دلائل دیے اور جیسا کہ ان کا مزاج ہے، انہوں نے بہت کھل کر اپنا موقف پیش کیا۔ان کا کہنا تھا کہ تحریک سے نفرت اور تصادم کی آگ بھڑکے گی، لیکن حاصل کچھ نہیں ہوگا۔ کچھ دن بعد آئی ایس آئی کے ایک افسر جو آہیر کے ہم جماعت رہے تھے، اور اب تک ان کے دوست چلے آتے ہیں، ان سے ملنے آئے۔انہوں نے آہیر سے کہا کہ وہ جنرل اختر عبدالرحمٰن سے ان کی ملاقات کرانا چاہتے ہیں، کسی قدر تامل اور ردوقدح کے بعد وہ اس پر آمادہ ہو گئے۔ان کی آمدورفت کا سرکاری طور پر انتظام کیا گیا، اور انھیں اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں ٹھیرانے کا بندوبست کیا گیا، لیکن آہیر نے سرکاری میزبانی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ایک دبنگ آدمی کی طرح انہوں نے کہا کہ وہ تبادلہ خیال کرنے آئے ہیں، اور انہیں کسی مہربانی کی ضرورت نہیں ہے۔دوڈھائی گھنٹے کی ملاقات میں آہیر نے صدر ضیاالحق کی شخصیت، اندرونی پالیسیوں اور خاص طور پر ان کی افغان حکمت عملی پر بہت سخت نکتہ چینی کی۔ جنرل اختر خاموشی اور توجہ سے سنتے رہے، اور جب وہ اپنی بات ختم کر چکے، تو جنرل نے حکومتی پالیسیوں بالخصوص افغانستان کے بارے میں اپنے تجزیے اور معلومات سے انہیں آگاہ کیا۔جیسا کہ بعد میں انہوں نے بتایا کہ جنرل نے بڑی خوبصورتی سے اپنا کیس پیش کیا اور ان کے دل ودماغ پر اس کا گہرا اثر ہوا۔انہوں نے پارٹی کے راہنما سے یہ نہیں کہا کہ وہ حکومت کی مدد یا حمایت کریں، بلکہ اس کے برعکس انہوں نے صاف طور پر کہا کہ وہ وہی کریں، جو وہ اخلاقی طور پر درست سمجھتے ہیں۔اس ملاقات میں پیپلز پارٹی کے دو اور راہنما بھی موجود تھے، جو ان دنوں اعلیٰ سرکاری مناصب پر فائز ہیں۔اگر ان کے نام فاش کر دیے جائیں، تو ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہو۔

ان چاروں آدمیوں کی دوسری ملاقات ٹھیک ایک سال بعد ستمبر 1984ء میں جنرل اختر کے گھر پر ہوئی، جہاں انہوں نے تینوں سیاست دانوں کو

کھانے پر مدعو کیا تھا۔ اس اثنا میں وہ متنازعہ صدارتی ریفرنڈم ہو چکا تھا، جس کے ذریعے صدر نے مزید پانچ سال تک اقتدار میں رہنے کی راہ ہموار کر لی تھی۔ آہیر اس کھیل سے الگ تھلگ رہے، بلکہ صدر کچھ دن بعد سرگودھا گئے اور آہیر کو ان سے ملنے کی دعوت دی گئی، تو انہوں نے اس سے انکار کر دیا تھا۔ ان کے بقول 1985ء کے انتخابات میں انہوں نے مقامی دباو کی وجہ سے شرکت کی۔ انہیں اندیشہ تھا کہ اگر وہ الگ تھلگ رہے تو ان کا سیاسی گروپ تحلیل ہو جائے گا۔ وہ انتخابات جیت چکے تو صدر نے ٹیلی فون پر انہیں مبارک باد دی اور کہا کہ وہ اپوزیشن میں رہیں یا حکومت کا ساتھ دیں، لیکن ان کی کامیابی سے انہیں خوشی ہوئی ہے، کیونکہ انہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ایک محبّ وطن آدمی ہیں

محمد خان جونیجو کو وزیراعظم نامزد کرنے کے بعد ان کے لیے حمایت حاصل کرنے کی غرض سے صدر نے ارکان اسمبلی سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کیا، تو سرگودھا ڈویژن کے 9 دوسرے ارکان کے ساتھ نسیم آہیر بھی ایوان صدر راولپنڈی میں مدعو کیے گئے، جہاں گورنر جیلانی بھی موجود تھے۔ باقی لوگوں نے تو جونیجو کی حمایت میں ایک تحریر پر دستخط کر دیے، لیکن نسیم آہیر نے صاف جواب دے دیا۔ انہوں نے سپیکر کے لیے صدر کے امیدوار خواجہ صفدر کی بجائے فخر امام کی حمایت کی۔ راولپنڈی اسلام آباد میں جہاں نسیم آہیر قومی اسمبلی کے اجلاسوں میں شرکت کے لیے جاتے تھے، اب جنرل اختر سے ان کی مزید ملاقاتیں ہوئیں۔ اب ان کے اندر مشترک نکات ابھر رہے تھے۔ جنرل اختر انہیں قائل کرتے رہے اور ہر بار وہ کہتے، ''اگر آپ اخلاقی طور پر قائل ہیں تو اس پالیسی کی حمایت کریں۔'' آہیر کبھی ان کی بات مان لیتے، کبھی خاموش رہتے، اور کبھی انکار کر دیتے۔ مئی 1985ء کے وسط میں صدر نے انہیں بلایا اور بہت تفصیل کے ساتھ گفتگو کی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ملک کے لیے نئی، محبّ وطن قیادت ابھارنے کے آرزومند ہیں، اور غیر جماعتی انتخابات کا انعقاد اسی سمت میں ایک قدم ہے۔ جنرل ضیاالحق نے گفتگو کے آغاز میں ان سے کہا کہ وہ ملک کے صدر، فوج کے سربراہ اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ہیں، اور انہیں ایک رکن اسمبلی کی بہت زیادہ پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن چونکہ وہ انہیں ایک مخلص اور محبّ وطن آدمی سمجھتے ہیں، لہذا ان کے سامنے بعض حقائق پیش کرنے کے آرزومند ہیں۔ انہوں نے افغان پالیسی سمیت بہت سے اہم امور کی وضاحت کی اور کہا کہ وہ ان سے مستقبل کے لیے بہت سی توقعات رکھتے ہیں۔ بے تکلفی کے ساتھ انہوں نے کہا کہ اس کے لیے ان کا (نظریاتی طور پر) راہ راست پر آنا ضروری ہے۔ آہیر نے ان کے ساتھ بحث کی اور بہت سے سوالات اٹھائے، لیکن جب وہ ایوان صدر سے واپس آئے تو وہ انہیں اپنا لیڈر تسلیم کر چکے تھے۔

جونیجو، دبنگ نسیم آہیر کو مسلسل پیغام بھیج رہے تھے۔ وہ انہیں اپنی پسند کی کوئی بھی وزارت دینے کو تیار تھے۔ وہ جونیجو سے ملنے نہیں گئے۔ انہوں نے مسلم لیگ کا حصہ بننے سے انکار کر دیا اور پارٹی کے کنونشن میں شرکت سے گریز کیا۔ مارشل لا اٹھنے کے تین ہفتے بعد 21 جنوری 1986ء کی رات کو وزیراعظم نے انہیں (موجودہ وزیر خزانہ) سینیٹر احسان الحق پراچہ کے ہاتھ واضح طور پر پیغام بھیجا کہ وہ انہیں اپنی کابینہ میں شامل کرنے کے خواہش مند ہیں۔ اسی روز صدر کے ملٹری سیکرٹری انہیں اگلے روز ساڑھے دس بجے ملاقات کے لیے کہہ چکے تھے۔ آہیر وزیراعظم کی بجائے، جواب بااختیار تھے، اور مناصب بانٹ رہے تھے، پہلے صدر سے ملنے گئے۔ انہوں نے صدر سے گلہ کیا کہ وہ نئی سیاسی قیادت ابھارنے اور 1990ء میں نئے انتخابات کرانے کے منصوبے سے گریز کی راہ پر چل نکلے ہیں اور یہ کہ اب سب کچھ ان کی طے کردہ پالیسی کے خلاف ہو رہا ہے۔ صدر نے کہا، ان کی خواہش تو یہی ہے کہ جونیجو پارٹی نہ بنائیں، اگلے چار سال نئی قیادت کو شناخت کر کے اس کی تربیت کریں، 1990ء میں جماعتی انتخابات ہوں، اور اقتدار نئے لیڈروں کے سپرد کر دیا جائے۔ صدر نے کہا کہ مشکل یہ ہے، وزیراعظم جماعت بنانے پر بضد ہیں۔ اب اگر میں رکاوٹ ڈالتا ہوں یا ان کو ہٹا دیتا ہوں تو لوگ یہ تاثر لیں گے کہ ہم کسی کو کام کرنے دینا نہیں چاہتے۔ اب یہی ایک راستہ باقی ہے کہ وزیراعظم کے ہاتھ مضبوط کیے جائیں۔ ان کے گرد ایسے لوگ موجود ہوں، جو ان کی مدد کریں، اور انہیں غلط لوگوں سے بچایا جائے۔ انہوں نے دو وزرا کے نام لیے، جن میں سے ایک نے بعد ازاں صدر اور

وزیراعظم کے مراسم بگاڑنے اور فوج کے ساتھ جونیجو کے تصادم کو یقینی بنانے کے لیے کام کیا۔ نسیم آہیر نے صدر کو بتایا کہ جونیجو انہیں وفاقی وزیر اور پارٹی کا پارلیمانی سیکرٹری جنرل بنانا چاہتے ہیں۔ صدر نے کہا، ''وزیراعظم آپ کو کابینہ میں ضرور شامل کرلیں گے، لیکن میں یقین سے کہتا ہوں کہ وہ آپ کو پارٹی کا سیکرٹری جنرل ہرگز نہیں بنائیں گے۔'' صدر کے مشورہ پر آہیر اگلے روز وزیراعظم سے ملے۔ صدر کا اندازہ درست تھا، آہیر کو وزارت تعلیم کی پیش کش کی گئی، لیکن اپنے پیغام کے برعکس وزیراعظم نے پارٹی عہدے کا ذکر تک نہ کیا۔ 22 جنوری کو انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان کر دیا، اور 26 جنوری کو انہوں نے مارشل لا کے بعد بننے والی نئی کابینہ کے دوسرے ارکان کے ساتھ حلف اٹھایا۔ نسیم آہیر جونیجو کے وزیر تو بن گئے، لیکن جونیجو ان کے لیڈر نہ بن سکے۔ پیپلز پارٹی کی غیر ذمے دار پالیسیوں سے بیزار ہو کر بغاوت کرنے والے آدمی کا لیڈر ضیاالحق تھا یا اختر عبدالرحمٰن۔

اختر عبدالرحمٰن میں وہ کون سی چیز تھی، جس نے اس کا دل موہ لیا تھا اور وہ بار بار ان سے رجوع کرتے تھے۔ نسیم آہیر اس سوال کا جواب دیتے ہوئے قدرے جذباتی ہو جاتے ہیں۔ ان کے بقول اس آدمی کا پیکر ایک خواب سے روشن تھا۔ اس کے سامنے مستقبل کا ایک نقشہ تھا، جس کے لیے وہ اپنا سب کچھ قربان کر سکتا تھا۔ افغانستان کی آزادی اس عظیم خواب کا ایک چھوٹا سا حصہ تھا، جو اس نے دیکھا، اور اس کی جان میں ایک چراغ کی طرح جلتا رہا۔ اسلام کی محبت سے اس کا دل روشن تھا، لیکن وہ انقلابی نہیں، ارتقائی راستے کا مسافر تھا، اور اسے یقین تھا کہ یہی راستہ بہترین ہے۔ وہ اس مکتب فکر کا نمایندہ تھا، جس کے سرسید سے آغاز کیا اور جس نے قائداعظم ایسا لیڈر چنا۔ وہ اس خطہ ارض میں ایک نئی سیاسی قیادت اور ایک عظیم عسکری قوت پیدا کرنے کا آرزومند تھا، ایک مضبوط اور مستحکم پاکستان، جو ایک اسلامی بلاک کا مرکز و محور بن سکے۔

صرف افغان پالیسی پر روس کی حمایت کرنے اور غیر ملکیوں سے تعلقات رکھنے والے سیاستدان ہی آئی ایس آئی کا ہدف نہ تھے۔ کچھ اور لوگ بھی اس کا شکار ہوئے۔ ان میں نامور جرنیل بھی شامل ہیں۔، جن کی خواہشات پوری نہ ہو سکیں، اور جن کا محاسبہ کیا گیا اور جو ترقیوں سے محروم رہے۔ ایک ممتاز ریٹائرڈ جنرل، جو بظاہر اچھی شہرت کے مالک تھے، بعض ناگوار مشاغل رکھتے تھے۔ اگرچہ کوئی شخص یہ گمان نہیں کر سکتا تھا۔ صدر کے دل میں ان کے لیے بڑا احترام تھا۔ وہ پنجاب کی گورنری کے خواہش مند تھے۔ اور صدر انہیں یہ منصب سونپنے پر آمادہ تھے۔ لیکن جنرل اختر سے مشورہ مانگا گیا تو انہوں نے اس کی مخالفت کی۔ صدر کی خواہش پر انہیں حقائق سے آگاہ کر دیا گیا۔

1984ء میں جب بلوچستان کے گورنر جنرل رحیم الدین کو ترقی دے کر چیئرمین چیفس آف سٹاف کمیٹی بنایا گیا، تو سندھ کے گورنر عباسی بھی ریٹائر کر دیے گئے۔ اب نئے گورنر کے انتخاب کا مرحلہ درپیش تھا۔ صدر ایک ریٹائرڈ جنرل کو گورنر مقرر کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے، جو ان کی کابینہ میں شامل رہے تھے، لیکن جنرل اختر نے انہیں آگاہ کیا کہ وہ بدعنوانی کے مرتکب ہوتے رہے ہیں۔ ان کے پاس تفصیلات موجود تھیں اور ثبوت بھی۔ صدر کی خواہش پر انہوں نے راولپنڈی کے کور کمانڈر جنرل جہانداد کا نام تجویز کیا، جو ایک سیدھے سادھے سپاہی تھے، لیکن ایک اچھے منتظم۔

مارچ 1987ء میں جنرل اختر عبدالرحمٰن کو فور سٹار جنرل بنانے کے بعد آئی ایس آئی سے الگ کر کے جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کا چیئرمین بنا دیا گیا۔ 1982ء میں جنرل غلام جیلانی خان کو دل کا دورہ پڑنے پر انہیں پنجاب کی گورنری کی پیشکش کی گئی، تو انہوں نے یہ کہتے ہوئے صدر سے معذرت کر لی تھی کہ وہ افغانستان کی جنگ کو درمیان چھوڑ نا نہیں چاہتے۔ 1984ء میں بلوچستان کے گورنر جنرل سردار ایف ایس لودھی کے طیارے کو حادثہ پیش آیا تو صدر نے انہیں اس صوبے کی گورنری کی پیش کش کی۔ جنرل اختر نے ابھی وضاحت سے اپنا ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا کہ صدر خود ہی تامل کا شکار ہو گئے اور بلند آواز سے سوچنے کے انداز میں کہا، ''ہاں، ٹھیک ہے، آپ افغانستان کو نہیں چھوڑ سکتے۔'' جنرل اختر چار ستاروں والے جرنیل کا مرتبہ پانے پر تو خوش تھے، لیکن وہ افغانستان کو اب بھی چھوڑ نا نہیں چاہتے تھے۔ صدر نے 1984ء میں ان سے کہا تھا، وہ ان کے مرتبے میں اضافے کے

باوجودان کی ذمے داریاں برقرار رکھیں گے۔

اب روسی افغانستان سے واپسی پر آمادہ دکھائی دیتے تھے اور مسلسل اس طرح کے اشارے دے رہے تھے۔ شاید صدر یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ اب آئی ایس آئی کو، جس نے 9 سال تک روسی اور بھارتی سازشوں کا کامیابی سے مقابلہ کیا ہے، نئے ہاتھوں میں منتقل کرنے کا وقت آپہنچا ہے۔ ادارے نشوونما پاتے اور پروان چڑھتے ہیں تو انہیں اپنے پاوں پر کھڑا ہونا ہوتا ہے، کسی آدمی کو ان کے لیے ناگزیر نہیں بنایا جاسکتا۔ پھر بھی اپنی تخلیق سے جدا ہونے کا وقت آیا تو جنرل وک اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا، اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ اس کا جانشین کون ہوگا، عمر بھر اس نے اپنے جذبات پر قابو رکھا تھا۔ وہ ڈسپلن کی پابندی کرنے والا آدمی تھا اور وفاداری اس کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ضیاالحق اس کا لیڈر اور سردار تھا، جو ہنگاموں، مشکلات اور طوفانوں میں اس کی پشت پر پہاڑ کی طرح کھڑا رہا تھا۔ آزردگی اور دل گرفتگی کے ساتھ اس نے کہا ضرور اس میں کوئی مصلحت ہوگی۔ شاید بری فوج کو میری ضرورت ہو، شاید کچھ اور سبب ہو، لیکن کیا آئی ایس آئی مستقبل میں بھی ایسا ہی ادارہ رہے گی، کیا وہ افغانستان کی آزادی کے آخری مرحلے میں اپنا کردار اسی کمال سے ادا کرسکے گی، اس سوال کا جواب تو مستقبل کو دینا تھا۔ ملال کے ساتھ اس نے صرف یہ کہا، ''ایک سال تک تو کام چلتا رہے گا، اس کے بعد اللہ جانے۔''

ٹھیک ایک سال بعد اوجڑی کیمپ کا سانحہ پیش آیا، جب جڑواں شہروں اور جنرل کے دل پر قیامت گزر گئی۔ اور اس کے ایک دوست نے اسے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا، لیکن وہ کیا کرسکتا تھا۔ چیخ وپکار سے بھری آبادیوں پر لوہا برس رہا تھا، آئی ایس آئی کے سابق سربراہ جنرل ریاض کے سمدھی خاقان عباسی سمیت ایک سو سے زیادہ انسان دیکھتے ہی دیکھتے موت کی آغوش میں جاسوئے۔ سیکڑوں گھر برباد اور ہزاروں لوگ زخمی ہوئے۔ یہ اس کی ذمے داری نہیں تھی۔ لیکن صدر اور وزیراعظم سے ملک سے باہر تھے۔ آہنی عزم کے ساتھ وہ آگے بڑھا اور اس نے معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ بحران کا آدمی تھا۔ قیامت کی گھڑی میں وہ قوم کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ وہ اس وقت حیرت زدہ رہ گیا، جب بعض لوگ اسی کو مورد الزام قرار دینے لگے، جبکہ آئی ایس آئی اور اوجڑی کیمپ سے اس کا تعلق منقطع ہوئے ایک سال گزر چکا تھا۔ یہ کیسے لوگ تھے اور کیا چاہتے تھے۔